اقبال اور وحشت

وفا راشدی

''مولانا رضا علی وحشت معمولی شخصیت کے آدمی نہیں تھے - وہ عالمِ متبحّر اور فاضلِ اجل تھے - اُردو ، فارسی اور عربی زبانوں اور ان کے ادبیات پر وہ ماہرانہ اور مبصرانہ عبور رکھتے تھے - انگریزی زبان پر بھی ان کو اتنی قدرت حاصل تھی کہ اس میں تنقیدیں اپنے زمانے میں اختراعات کا درجہ رکھتی تھیں - یہ تنقیدیں زیادہ تر اس دور کے سب سے زیادہ مقتدر اُردو جریدہ ''مخزن'' لاہور میں شائع ہوتی رہیں - دوسرے مسائل اپنے تنوعات کے باوجود اساسی اعتبار سے مخزن کے ہم خیال ، ہم نظر اور ہم آہنگ تھے - اس لیے اگر ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۰ء تک ادبی اور ثقافتی اکتباسات کو کسی دبستان کے نام سے موسوم کیا جائے تو اس کو ''دبستانِ مخزن'' کہنا بہت مناسب ہوگا - وحشت اسی دبستان کے تربیت یافتہ تھے اور اپنے ہم دبستانوں میں بڑی قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے -''[1]

پروفیسر مجنوں گورکھپوری جیسے بزرگ نقاد کی یہ رائے گرامی ان کی معرکہ آرا کتاب ''غالب شخص اور شاعر'' (ص ۱۰۴) سے اقتباس ہے - اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لاہور کا ماہنامہ ''مخزن'' اُس زمانے سر عبدالقادر جیسے یگانۂ عصر اہلِ قلم اور ایڈیٹر کی ادارت میں خاص اہتمام اور خاص انداز سے شائع ہوتا تھا - قومی کردار کی تعمیر و اصلاح ، معاشرے کی تشکیل و تطہیر اور علم و ادب کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں جو کام اُنیسویں صدی کے دوسرے نصف میں سرسید احمد خاں کے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' نے کیا تھا وہی کام بیسویں صدی کے آغاز میں ''مخزن'' نے کیا - پورے برصغیر میں مخزن کا حلقہ اتنا

۱- ''غالب شخص اور شاعر'' از پروفیسر مجنوں گورکھپوری ، ص ۱۰۴ -

وسیع تھا کہ اس نے "دبستانِ مخزن" کی صورت اختیار کر لی تھی ۔ مخزن کے قلمی معاونین میں متحدہ ہندوستان کی صفِ اول کے اہلِ قلم مثلاً مولانا حسرت موہانی ، اکبر الٰہ آبادی ، جلیل مانکپوری ، قاضی عبدالغفار ، سجاد حیدر یلدرم ، نوح ناروی اور نیاز فتح پوری شامل تھے ۔ زندہ دلانِ پنجاب میں سر عبدالقادر ، علامہ اقبال ، مولانا ظفر علی خاں ، حکیم یوسف حسن ، میاں بشیر احمد ، ڈاکٹر تاثیر ، اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری جیسے مشاہیرِ اُردو اور اکابر ادب کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں ۔ پنجاب کی ان نامور ہستیوں میں سر عبد القادر ، علامہ اقبال ، ظفر علی خاں اور حفیظ جالندھری سے مولانا رضا علی وحشت سے دوستانہ تعلقات تھے ۔ ان بزرگوں میں بے انتہا خلوص و محبت کے مراسم استوار تھے ۔ ان میں آخری دم تک یہ رشتۂ اخلاص و مروت بذریعہ خط و کتابت بھی قائم رہا ۔ اُس زمانے میں لاہور کے ادبی ماحول اور اس کی خصوصیات کا اندازہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے :

"علامہ اقبال ، شیخ عبدالقادر ، چوہدری شہاب الدین اس زمانے میں لاہور کی ثقافتی فضا کی روحِ رواں تھے ۔ ان حضرات سے ظفر علی خان کے دوستانہ مراسم بہت جلد قائم ہو گئے ۔ ان باکمال ہستیوں کے اجتماع سے دہلی لکھنؤ اور حیدر آباد (دکن) کے علاوہ لاہور بھی اُردو ادبیات کا ایک بہت بڑا گہوارہ بن گیا ۔ ان ہستیوں کا باہم مل بیٹھنا ہی ادبیاتِ اُردو کی حیاتِ نو کا پیش خیمہ تھا ۔ صبح و شام ملاقاتیں ہوتیں ۔ بہت سے معاشرتی مسائل زیرِ بحث آئے اور انہی مباحث کا ماحصل شعر و ادب کا جامہ پہن کر لوگوں کے سامنے آ جاتا ۔"[۲]

اسی عصری فضا کا ذکر برصغیر کے مشہور و ممتاز اور بزرگ نقاد پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے اپنی معرکہ آرا کتاب "غالب شخص اور شاعر (ص ۱۰۷) میں بھی کیا ہے ۔ جس کی چند سطریں یہ ہیں :

"وحشت کے ان معاصرین میں جو کم و بیش ان کے ہم عصر تھے جن سے ان کے تعلقات مخلصانہ تھے ۔ سر عبدالقادر ، ڈاکٹر علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں تاریخ ساز ہستیاں تھیں ۔ یہ لوگ صدقِ دل سے وحشت

۲۔ ظفر علی خاں ، ادیب و شاعر ، ص ۸۱ ، ۸۲ ۔

کے قدر شناس تھے اور سب نے جی کھول کر ان کے کلام کی داد دی ہے ۔"

حقیقت یہ ہے کہ مولانا وحشت صرف استادِ فن و سخن ہی نہ تھے بلکہ تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی منفرد مقام کے حامل تھے ۔ ان کی نگارشاتِ نظم و نثر دونوں معیاری اور اعلیٰ پایہ کی ہوتی تھیں ۔ وحشت کے تنقیدی مقالات جو مخزن میں شائع ہوئے وہ ان کی تنقیدی بصیرت اور محققانہ فکر و نظر کا مظہر ہیں ۔ وحشت کا دبستان مخزن سے کیا تعلق تھا اور اہلِ پنجاب کی نظر میں ان کا کیا مقام تھا ، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سر عبدالقادر ایک مصرعہ طرح تجویز فرماتے اور اس پر وحشت اور اقبال کی ہم طرحی غزلیں ایک صفحے پر مخزن کی زینت بنتیں ۔ عبدالقادر نے وحشت کو مخزن کے حصۂ نظم کی ادارت کی پیش کش بھی کی تھی ، لیکن وہ اپنی عدیم الفرصتی کے باعث قبول نہ کر سکے ۔ وحشت کی شاعری اور انشاء پردازی سے متعلق سر عبدالقادر نے وقتاً فوقتاً جس گراں مایہ خیالات کا اظہار فرمایا تھا وہ مخزن کے اداریوں اور دیگر صحیفوں کے اوراق میں محفوظ ہیں ۔ سر عبدالقادر کلکتہ کے بعض دیگر مقتدر ادیبوں کی پذیرائی بھی فرماتے تھے ، جس میں پروفیسر عبدالغفور شہباز کا نام بھی قابلِ ذکر ہے ۔ پروفیسر شہباز کی ایک کتاب کا دیباچہ تحریر فرمایا تھا جو اپنے وقت ہی ان کے بانگِ درا کے دیباچہ کی طرح مقبول ہوا ۔

"دبستانِ مخزن" کے تیسرے اہم رکن مولانا ظفر علی خان سے علامہ وحشت کی راہ و رسم کی ابتدا بھی مخزن کے ذریعے ہوئی تھی ۔ مولانا موصوف وحشت کی شاعرانہ عظمت اور اخلاص و محبت کے دل سے قائل تھے اور حسبِ موقع اس کا اظہار بھی فرماتے تھے ۔ ۱۹۱۰ء میں جب وحشت کا پہلا شعری مجموعہ منظرِ عام پر آیا تو مولانا ظفر علی خان نے ان کی فارسی اور اُردو شاعری سے متعلق اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار فرمایا اور اپنے روزنامہ زمیندار لاہور مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۱۵ء میں شائع کیا ۔ اس تبصرے کو مولانا ظفر کے ابیات کا ایک نادر نمونہ بھی کہا جا سکتا ہے اور اب یہ نوادراتِ ظفر کے سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے :

"مولوی رضا علی وحشت کنتی کے اُن سخن وروں میں سے ہیں جن کا کلام اپنی رنگینی و رعنائی کے باعث قبولِ عام کی سند حاصل کر چکا ہے ۔ آپ کی نازک خیالی اور معنی آفرینی ذوقِ سلیم کے خراجِ تحسین وصول

کرتی ہیں اور ملک کے سربرآوردہ اُردو رسائل اپنے حصہ' نظم کو آپ کی غزلیات سے زینت دینا داخلِ فیشن سمجھتے ہیں ۔ مولانا کے کلام کا بڑا حصہ ملک کے سخن سنج طبقے تک اگرچہ اس طور پر پہلے ہی پہنچ چکا ہے لیکن ہم اس ضرورت کو ایک عرصہ سے محسوس کر رہے تھے کہ آپ اپنے کلام کا مکمل مجموعہ مرتب کرکے شائع کر دیں تا کہ نہ صرف وہ حضرات جو پہلے ہی اس سے مستفید ہو چکے ہیں اس سے قندِ مکرر کا لطف اُٹھائیں بلکہ ذی مذاق اصحاب بھی اس سے بہرہ اندوز ہو سکیں ۔ اس ضرورت کو مولانا نے ڈیڑھ سو صفحات کے ایک دیدہ زیب دیوان کی اشاعت سے پورا کیا ہے ۔ جس میں آپ کی مختلف الاصناف نظمیں جمع کر دی گئی ہیں ۔

مولانا کے دیوان ہی سے نمونے کے طور پر کسی حصے کا انتخاب کرنا بوجہ اس کے حشو و زائد سے پاک ہونے کے ویسا ہی مشکل ہے جیسا ''دیوانِ حافظ'' کا انتخاب کرنا ۔ اس قسم کے ترانوں سے جنہیں سن کر روح وجد میں آتی ہے دیوان بھرا پڑا ہے ۔ مولانا وحشت ریختہ گوئی ہی کے فن لاطولیٰ نہیں رکھتے بلکہ آپ کا فارسی کلام بھی اُستادانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے ۔ جس زمانے میں ہز رائل ہائنس پرنس آف ویلس رونق افروز ہند ہوئے تھے ۔ مولانا نے ایک مخمس (اس مخمس کا انگریزی منظوم ترجمہ شری ہری ناتھ لائبریرین امپیریل لائبریری کلکتہ نے اسی موقع پر کیا تھا) ہز ہائنس کی مدح میں تحریر فرمایا تھا ۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ شاعر ایک شعر کہتا تھا اور سخن شناس اس کے صلے میں اسے سونے چاندی میں تولتے تھے ۔

رضی دانش نے جب یہ شعر کہا :

تاک را سر سبز کن ایں ابر نیساں در بہار
قطرہ تا مئے می تو الد شد چرا گوہر شود

تو دارا شکوہ نے اسے ایک لاکھ روپیہ عطا کیا ۔ یا یہ ایک زمانہ ہے کہ تخیل کے جواہر ریزوں کے ایک ایسے بے بہا گنجینہ جیسا دیوانِ وحشت ہے ، ایک روپیہ قیمت رکھی گئی ہے ، لیکن زمانے کی ناقدردانی سے بے چارہ شاعر اپنے دیوان کے سرورق پر غالب کے الفاظ میں یہ اندیشہ ظاہر کرتا ہے :

تازدیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن
ایں مے از قحط خریداران کہن خواہد شدن

لیکن باوجود نظم کی کساد بازاری اور ابنائے زمانہ کی تاجداری کے ہمیں

یقین ہے کہ ہمارے دوست مولانا رضا علی وقت کا کلام اپنی قدر کرا لے رہے گا اور ان کے دیوان کی کئی دفعہ چھپنے کی نوبت آئے گی۔"[۳]

اُردو ادب کے لیے یہ امر خوش آئیند ہے کہ زمانے کی ناقدری اور مولانا وحشت کے اندیشہ کے باوجود مولانا ظفر علی خاں کی یہ پُر خلوص آرزو اور دل سے نکلی ہوئی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ کلامِ وحشت کی قدر و قیمت روز بروز بڑھتی ہی گئی۔ نہ صرف وحشت کی زندگی میں بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی انھیں عزت و احترام کا وہ مقام عطا ہوا جو اُردو کے بہت کم شاعروں کو ہوا۔ دیوانِ وحشت کے بعد ان کے کئی مجموعہ منظومات چھپے اور اربابِ فکر و دانش سے خراجِ تحسین وصول کیے۔ ترانۂ وحشت (مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور اور دیگر اشاعتی ادارے کراچی) کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، وہ بھی اب نایاب ہیں۔ باقیات، نقوش و آثار (قرآن منزل ڈھاکہ) کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ آج بھی اس کی مانگ موجود ہے۔ وحشت کی اس مقبولیت سے "دبستانِ محزن" کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

سر عبدالقادر اور مولانا ظفر علی خان کی طرح علامہ اقبال بھی وحشت کے بہت قدردان تھے۔ اقبال اور وحشت کی دوستی اپنی مثال آپ تھی۔ وحشت کے دل میں بھی اقبال کی بے حد قدر و منزلت تھی۔ انھوں نے اہلِ بنگال کی ناقدری و وحشت ناشناسی کا گلہ ان الفاظ میں کیا تھا:

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لیے

لیکن انھوں نے اقبال اور اہلِ پنجاب کی قدر افزائی کا اعتراف نہایت افتخار و انبساط سے کیا ہے:

اگر بنگالہ قدرِ من نمی داند چہ غم وحشت
صدائے می دہد از گوشہ پنجاب اقبالم

اقبال شناسی و اقبال نوازی کی ایسی مثالیں وحشت کے ہاں جا بجا ملتی ہیں۔ کلکتہ میں کبھی اقبال سے وحشت کی ملاقات ہوئی یا نہیں اس کا مجھے علم نہیں لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ وحشت کبھی پنجاب نہیں گئے۔ سینکڑوں

۳۔ روزنامہ زمیندار لاہور، ۲۴ اپریل، ۱۹۱۵۔

میل دور بیٹھ کر ان دو ہم عصروں میں جو ذہنی قربت تھی اس کی مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہے بلکہ اس ہمہ ہمی ، افراتفری ، خود سری و خود نگری کے دور میں تو اخلاص و ایثار کی ایسی باتیں سراسر مفقود ہیں ۔ علامہ اقبال وحشت کے نام اپنے ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں :

''میں ایک عرصے سے آپ کے کلام کو شوق سے پڑھتا ہوں اور آپ کا غائبانہ مداح ہوں ۔ دیوان تقریباً سب کا سب پڑھا اور خوب لطف اُٹھایا ۔ ماشاء اللہ آپ کی طبیعت نہایت تیز ہے اور فی زمانہ بہت کم لوگ ایسا کہہ سکتے ہیں ۔ آپ کی مضمون آفرینی اور ترکیبوں کی چستی خاص طور پر قابلِ داد ہے ۔ فارسی کلام بھی آپ کی طباعی کا ایک عمدہ نمونہ ہے ۔ شعر کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ ایک مستقل اثر پڑھنے والے کے دل پر چھوڑ جائے تو یہ بات آپ کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے ۔''[۴]

علامہ رضا علی وحشت کلکتوی نے ایک بلند مرتبہ غزل گو کی حیثیت سے جو شہرت و نام وری حاصل کی اُسے تاریخ ادبِ اُردو کبھی فراموش نہیں کر سکتی ، لیکن ان کے کلام کے غائر مطالعے سے ان کی شعری تخلیقات کا ایک اور اہم گوشہ ہمارے سامنے آتا ہے جو ان کی قومی نظموں اور سیاسی و ملی اشعار پر مشتمل ہے ۔ یہ نظمیں اور اشعار حب الوطنی ، انسان دوستی اور حریت و قومیت کے بے پایاں جذبات سے لبریز ہیں ۔ ان میں اسلام کے زریں نظریات ، اخوت ، مساوات اور انسانی آزادی کا عکس ہے ۔ زندگی و بیداری کا روح افزا پیغام ہے ۔

وحشت نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں جو مشرقی تہذیب اور اسلامی تمدن کا گہوارہ تھا ۔ وہ اسلامی تعلیمات اور علوم شرقیہ سے اچھی طرح بہرہ ور تھے ۔ جب انھوں نے شعر و ادب کی دنیا میں قدم رکھا تو داغ دہلوی اور امیر مینائی کا طوطی بول رہا تھا ۔ یہ ان کا آخری دور تھا ۔ محمد حسین آزاد کے طرزِ جدید کی شاعری کی بنیاد پڑ چکی تھی ۔ سرسید احمد خاں کی تحریر و تقریر نے مسلمانوں میں احساسِ حریت ، قومی

۴۔ ''معاصرین اقبال کی نظر میں'' از محمد عبداللہ قریشی ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ، بہ اشتراک اقبال اکادمی لاہور ، ص ۴۷۸ ، بحوالہ نقوش و آثار ، شائع کردہ قرآن منزل ، ڈھاکہ ، ص ۹۶ ۔

حمیت اور جذبۂ قومیت کی روح پھونک دی تھی ۔ مولانا حالی کی مسدس ''مد و جزر اسلام'' نے اُردو شاعری کا رخ پھیر دیا تھا ۔ سیاسی و سماجی مسائل ، مغربی تہذیب و تعلیم پر اکبر الٰہ آبادی کی کھلی تنقید اور شعریت کے ساتھ طنز و مزاح کے تیر و نشتر کے حوالے سے مغرب زدہ ماحول کو ایک نئی اور انقلابی سمت موڑنے کی مساعی جاری تھی ۔ اس سلسلے کی آخری کڑی ، ''ہمالہ اور صدائے درد'' کے خالق علامہ اقبال کے اعجاز شعر :

ع جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے

کی پیہم لہریں بساطِ کائنات پر اُبھر رہی تھیں :

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

یہ وہ زمانہ تھا جب وحشت کا عنفوانِ شباب تھا ۔ شہر کلکتہ وحشت کا وطن و مسکن تھا ۔ کلکتہ جو اُس وقت سیاست و انقلاب کا مرکز تھا ۔ ان کی آنکھوں کے سامنے کتنی ہی تحریکات نے جنم لیا اور کتنے ہی انقلابات رونما ہوئے ۔ کانگریس ، مسلم لیگ ، خلافت ، احرار ، تقسیم بنگال ، ترک موالات وغیرہ جیسی تحریکوں نے مسلمانانِ ہند کو کڑی آزمائشوں کے راستوں پر ڈال رکھا تھا ۔ ان حالات و واقعات کا وحشت کی زندگی پر اثر انداز ہونا لازمی تھا ۔ وہ فطرت کی طرف سے ایک حساس دل اور بیدار دماغ لے کر آئے تھے ۔ حبِ وطن ایک فطری جذبہ ہے ۔ وحشت بھی اس جذبہ سے سرشار تھے ۔ نخلِ آزادی سنگینوں کی چھاؤں ، شمشیروں کے سایوں اور شہیدوں کے لہو سے پروان چڑھتا ہے ۔ متحدہ ہندوستان کا دور غلامی ایک ایسے بحران سے گزر رہا تھا کہ ایثار و قربانی کے بغیر برطانوی سامراج کا خاتمہ ممکن نہ تھا ۔ جہاں پنجاب میں اقبال کی یہ آواز بلند ہوئی :

ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کرکے چھوڑیں گے
لہو رُو رُو کے محفل کو گلستاں کرکے چھوڑیں گے

وہاں سر زمین بنگال میں وحشت نے اہلِ وطن کو جوشِ طلب سے اس طرح آگاہ کیا :

بہارِ گل متقاضی ہے خونِ بلبل کی
کہ یہ بھی چاہیے رنگینیٔ چمن کے لیے

بدیسی نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند ہو چکا تھا ۔ سامراجیوں کی عیارانہ پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' ناکام ثابت ہو چکی تھی ۔ انگریزوں کی بے جا پُشت پناہی نے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کا حوصلہ بڑھایا اور انھوں نے مسلمانوں کو اقتصادی و سیاسی طور پر ایذا پہنچانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا نہ رکھی ، لیکن مسلمان بیدار ہو چکے تھے ۔ وہ مسلم قومیت کا مفہوم سمجھ چکے تھے ۔ وہ اپنا حق منوانا خوب جانتے تھے ۔ انگریزوں اور ہندوؤں پر مسلمانوں کے متعلق یہ بات ثابت ہو چکی تھی :

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

وحشت نے اپنے سیاسی اشعار میں اس زمانے سے تاریخی پس منظر کو نہایت خوبی سے پیش کیا ۔

ترے غمزے لڑا دیں گے مسلماں کو مسلماں سے
ترے عشوے بھڑا دیں گے برہمن کو برہمن سے

مسلمان سرزمینِ ہند پر آٹھ سو سال حکومت کر چکے تھے ۔ وہ ایک بہادر ، جانباز و جانثار قوم کی حیثیت سے ہمیشہ سربلند رہے ۔ ہندوؤں کی اسکیمیں ناکام ثابت ہوئیں ۔ انگریزوں کا قلع قمع ہوا :

پابندیٔ رسوم کو سمجھا ہے بندگی
زنار چھین لیں گے ابھی برہمن سے ہم

مسلم لیگ کی تحریک نے زور پکڑا تو قائد اعظم کی قیادت میں سارے برصغیر کے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو گئے ۔ ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال کے تصور پاکستان اور ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان کی چھاؤں میں مطالبۂ پاکستان کے نعروں سے برصغیر کی فضا گونج اُٹھی تو کانگریس نے انتقامی کاروائیوں کی ہوا اور تیز کر دی ۔ اقبال کے ساتھ ساتھ وحشت کا یہ پیغام بھی بنگال کے گوشہ گوشہ میں پھیل گیا :

گیا رنگ انتقامِ خزاں کا ہو دیکھیے
ڈرنے لگے ہیں جوشِ بہار و خزاں سے ہم
یہ کیسی کثرتِ گل ہے یہ کیا رونق ہے گلشن کی
جگہ کانٹے کو اب ہو گی یہاں میرے نشیمن کی

لازم ہے کارواں کو رہے آپ مستعد
شرمندۂ دمِ جرسِ کارواں نہ ہو

علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں جیسی مقتدر شخصیتوں کی گراں قدر آرا وحشت کی فارسی شاعری کے بارے میں بھی سندِ آخر کا حکم رکھتی ہیں ۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں :

''فارسی کلام بھی آپ کی طباعی کا ایک عمدہ نمونہ ہے ۔ شعر کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ ایک مستقل اثر پڑھنے والوں کے دل پر چھوڑ جائے ، سو یہ بات آپ کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے'' ۔۵

اور مولانا ظفر علی خاں رقم طراز ہیں :

''مولانا وحشت ریختہ گوئی کے فن میں ہی ید طولیٰ نہیں رکھتے بلکہ آپ کا فارسی کلام بھی اُستادانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے'' ۔۶

حقیقت یہ ہے کہ اُردو شاعری جس قدر وحشت کی رہینِ منت ہے ، وہ اربابِ ادب سے پوشیدہ نہیں ۔ لیکن فارسی شاعری بھی ان کے بارِ احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی ۔ انھیں فارسی شعر و ادب سے بھی فطری مناسبت تھی ۔ اس زبان میں اہلِ زبان جیسی قدرت رکھتے تھے ۔ فارسی زبان اپنی جن خصوصیات کے لیے ممتاز ہے ، ان کے کلام میں وہ خصوصیات بدرجۂ کمال موجود ہیں ۔ فارسی میں شعر کہنا دشوار نہیں لیکن فارسیت پیدا کرنا یقیناً دشوار ہے ۔ برصغیر پاک و ہند کے فارسی شعراء میں اُردو زبان کی بو نہیں جاتی ، لیکن وحشت کا شمار بلاشبہ عہدِ حاضر میں صفِ اول کے ان فارسی گو شعراء میں ہوتا ہے جن کا کلام اس عیب سے پاک ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے کلام کا بیشتر حصہ اُردو اور کم تر حصہ فارسی شاعری پر محیط ہے لیکن یہی کم تر حصہ اتنا کافی اور خاصا ہے کہ فارسی میں ان کی قادر الکلامی ، نکتہ سنجی ، بلند پروازی ،

۵۔ وحشت کے نام علامہ اقبال کے ایک مکتوب سے اقتباس مشمولہ ''نقوش و آثار'' ، ص ۹۶ ۔

۶۔ مولانا ظفر علی خاں کے اُس تبصرے سے اقتباس جو دیوانِ وحشت (مطبوعہ ستارۂ ہند پریس کلکتہ ، ۱۹۱۰ء) کے بارے میں روزنامہ زمیندار لاہور ، مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا تھا ۔

پختہ مشقی ، مضمون آفرینی کے گلہائے رنگا رنگ سے گلستانِ سدا بہار بنا ہوا ہے اور کاظم حسین محشر لکھنوی کے الفاظ میں :

''سب سے بالا تر اور لائق تحسین یہ امر ہے بلکہ اس کو مشقِ کمال یا کمالِ مشق کہنا چاہیے کہ فارسی بندشوں میں ادائے خیال کے وقت کسی مقام پر کہیں اُلجھن نہیں ۔ جو مضمون ہے وہ موتی کی طرح صاف ، جو تخیل ہے وہ بالکل پاک و پاکیزہ ۔ یہی طریقۂ بلاغت کی جان اور یہی اندازِ فصاحت کی روح ہے ۔ تمام دیوان دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا اصل نمونہ ہے''[۷] ۔

وحشت کے اُردو کلام میں جہاں میر کا سوز و گداز ، مومن کی جدت آمیز تراکیب اور غالب کی مضمون آفرینی و لطف بیان پایا جاتا ہے وہاں فارسی میں عرفی شیرازی ، شیخ علی حزیں ، شیخ سعدی ، ظہوری ، نظیری صائب جیسے اساتذہ کی بلند پروازی ، شیریں کلامی اور نکتہ آرائیوں کی چمک دمک سے دنیائے تخیلات پُرنور نظر آتی ہے ۔ وحشت کے فانوس غزل نے حافظ شیرازی کی شمع افکار سے بھی روشنی پائی ہے اور امیر خسرو کے انوار تصوف سے بھی پاکیزہ ، خیالات ، سنجیدہ رجحانات ، عارفانہ تصورات وحشت کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے ۔ یہی وہ راہ طلب ہے جس پر گامزن ہو کر شاعر سالہا سال کی مشق کے بعد عشق حقیقی کی روحانی لذتوں سے آشنا و بہرہ ور ہوتا ہے اور بقول مولانا روم :

ہرچہ گویم عشق را شرح و بیاں چوں بہ عشق آیم خجل باشم ازاں

گفتہ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

ہر نفس آواز عشق می رسد از چپ وراست
ما بہ فلک می رویم عزم تماشا کراست

مولانا روم کا یہی وہ جادو ہے جس نے علامہ اقبال کو نہ صرف اپنا گرویدہ بلکہ روحانی فرزند بنا لیا ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اقبال کی دنیائے افکار میں اسلام ، تصوف ، حقائق و معارف کا رنگ بھرنے میں مولانا روم ہی کے تخیلات و تصورات کا کرشمہ ہے جس کی بہترین مثالیں اقبال کے

۷۔ ماہنامہ ''معیار لکھنو'' مئی ۱۹۱۵ء

''جاوید نامہ'' ''پیام مشرق'' اور ''اسرار خودی'' میں ملتی ہیں ۔ وحشت کے ہاں بھی عشق حقیقی کے موضوع پر کثرت سے اشعار ملتے ہیں ۔

یہ وہ عہد تھا جب برصغیر کے ہر گوشے میں اقبال کی آوازیں گونج رہی تھیں ۔ اوپر کی سطروں میں جن عوامل و کوائف کا احاطہ کیا گیا ہے ان کی روشنی میں اس امر کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ فکر اقبال سے وحشت کا متاثر ہونا ایک قدرتی امر تھا ۔ لیکن یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ اقبال کے انداز میں وحشت کے ہاں فارسی میں طرز فکر تو ضرور ملتا ہے لیکن اس شدت سے نہیں جس شدت سے غالب و حافظ کے رنگ میں ملتا ہے ۔ وحشت نے اقبال کی کوئی تقلید نہیں کی ۔ ان سے براہ راست اثر قبول نہیں کیا ۔ دونوں کا رنگ جدا جدا ہے ۔ یہی حال اقبال کا تھا ۔ اقبال ، حافظ اور غالب کے علاوہ پاک و ہند و عجم کے دوسرے اساتذہ سخن سے متاثر ضرور تھے لیکن جس حد تک افکار اقبال پر مولانا روم کے اثرات غالب ہیں ، اس حد تک دوسروں کے نہیں ۔ اس ضمن میں اقبال اور وحشت کے فارسی کلام کا ایک مختصر تقابلی جائزہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا ۔ اقبال کی زمین پر وحشت کی ایک فارسی غزل ملاحظہ فرمائیے :

دلم از مستی آن نرگس مستانہ می رقصد
کہ از ذوق سرورش کعبہ و بت خانہ می رقصد

نہ تنہا از نشاط مئے ہمیں پیمانہ می رقصد
برقص آیند چوں ساغر کشاں میخانہ می رقصد

کدامی گیسوئے برہم بسر آراستن دارد
کہ یا رب در کف مشاطہ اشب شانہ می رقصد

چو از حد بگزرد سوز محبت اشک و اسوزد
بہ بزم سوختن پروانہ با پروانہ می رقصد

بہانا شوخئی نازش مرا تعلیم فرما شد
تپد در سینۂ دل گوئی کہ بیتابانہ می رقصد

خوش آن محفل کہ روشن میکند شمع جمال رو
سپند آسا دراں جا وحشت دیوانہ می رقصد[۸]

۸۔ ترانۂ وحشت نسخۂ کراچی دوسرا ایڈیشن ص ۴۰ ، ۴۱ ۔

یہ غزل خود وحشت کو بھی بہت پسند تھی - ۱۹۳۶ء میں ، میں نے ایک روز آپ کی خدمت میں عرض کیا حضور ! براہ کرم مجھے اپنی ایک بہترین فارسی غزل اپنی تحریر سے عنایت فرمائیں تو بے حد ذرہ نوازی ہوگی - انھوں نے از راہ شفقت میری درخواست پر یہ غزل لکھ دی :

ع صدائے می دہد از گوشہ پنجاب اقبالم[۹]

کا پس منظر اوپر پیش کیا جا چکا ہے - اس زمین میں اقبال کی غزل بھی موجود ہے - اب ذیل میں وحشت کی اس غزل کی نقل نذرِ قارئین ہے تاکہ وحشت اور اقبال کے فارسی کلام کا رنگ واضح ہو سکے - اس زمین پر اقبال کی غزل اہل نظر قارئین کرام کی نظر سے گزری ہوگی اس لیے اقبال کی غزل پیش نہیں کی گئی :

نہ گوش کس برآوازم نہ چشم کس برا حوالم
نمی دانم چرا در بزم بیدرداں ہمی نالم
حریف گل نیم اما کشم جور جہانے را
دریں گلشن برنگ سبزہ بیگانہ پا مالم
نخواہم دید اے صیاد دیگر آشیانِ خود
در اندک مدتے لذرِ قفس گردد پرو بالم
ہاں ذوق تن آسانی ہاں غفلت ہاں مستی
ندارد ہیچ فرق از سالہائے رفتہ ، امسالم
اگر بنگالہ قدر من نمی دانندچہ غم وحشت
صدائے می دہد از گوشہ پنجاب اقبالم[۱۰]

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء میں شاعر مشرق ، ملت اسلامیہ کے نوحہ خواں اور مصور پاکستان علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ ہماری محفل وطن سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوئے تو طوطی بنگال ، عاشق اقبال ، علامہ رضا علی وحشت کلکتوی نے نہایت والہانہ انداز میں خراج عقیدت کے یہ پھول پیش کیے :

۹- ترانۂ وحشت نسخۂ کراچی دوسرا ایڈیشن ص ۴۷

۱۰- اس غزل کے قلمی نسخہ کا عکس راقم کی تازہ کتاب ''حیاتِ وحشت'' میں شامل ہے -

یہ نہ کہہ اک شاعرِ ہندوستاں جاتا رہا
پیشوائے نکتہ سنجانِ جہاں جاتا رہا
باعثِ ماتم ، زمانے کو ہے موت اقبال کی
کارواں رویا کہ میر کارواں جاتا رہا
اب کہاں سے لائیگا کوئی حقیقت میں نظر
آہ ! اسرار خودی کا راز داں جاتا رہا
قصۂ ماضی میں تحریک عمل باقی نہیں
اب سنیں کیا ہم کہ لطف داستاں جاتا رہا
نالۂ غم میں وہ کیفیت نہ پائی جائے گی
آج ذوق شیوہ آہ و فغاں جاتا رہا
اب زبان خامہ پر پڑ ہی گئی مہر سکوت
وحشت رنگیں بیاں کا قدر داں جاتا رہا[۱۱]

۱۱- ترانۂ وحشت (نسخۂ لاہور) پہلا ایڈیشن ۱۹۵۳ء مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور ، ص ۱۷۱

چند نئی مطبوعات

قیمت

۱۔ منتخب مقالات اقبال ریویو - اردو
مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی — ۵۰/- روپے

۲۔ اقبال اور بھوپال — از صہبا لکھنوی — ۳۲/- روپے

۳۔ اتقان العرفان فی ماهیة الزمان
حکیم محمود احمد برکاتی — ۱۰/- روپے

Price

Selections from the Iqbal Review
Compiled by : Dr Waheed Quraishi — Rs. 50/-